مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

ہمارے معاشرتی رویے

سن تو مجھے حتمی طور پر یاد نہیں، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تازہ تازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کے بعد جامعہ میں میرا تقرر ہوا تھا یعنی کوئی ۱۹۹۰ء کے آس پاس کا زمانہ یعنی قصہ اس وقت کا ہے جب آتش جواں تھا۔

بھٹکل میں آباد مسلمانوں کے متعلق عام طور پر ہر آنے والا نووارد مہمان یہ تأثر ضرور لے کر جاتا ہے کہ یہاں کی مساجد نہ صرف نمازیوں سے الحمدللہ بھری رہتی ہیں بلکہ اس میں بوڑھوں سے زیادہ جوان اور جوانوں سے زیادہ بچے رہتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ سات سال سے بچوں کو نماز کا حکم دو، لیکن یہاں چار اور پانچ سال ہی سے اس کی تربیت کی جاتی ہے، اس کم عمری ہی میں بچوں کو مساجد میں نماز باجماعت کے لیے لانے سے عام نمازیوں کو ان کے شور وشغب اور ہنگامہ آرائی سے جو ذہنی کوفت ہوتی ہے وہ بعض اوقات بیان سے باہر ہوتی ہے، کچھ اسی طرح کا ایک واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا وہ سننے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ___ میں اپنے محلہ کی مسجد طوبی میں ایک دن عشاء کی جماعت میں شریک تھا اور پہلی صف ہی میں تھا، جب امام صاحب نے تکبیر تحریمہ کہی تو ہم نے بھی نماز کی نیت باندھ لی، کچھ ہی دیر اس پر گذری تھی کہ پچھلی صف میں موجود بچوں نے پہلی رکعت میں اتنی زور سے آمین بالجھر کی سنت ادا کی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹ جائینگے، خیر دوسری رکعت میں پھر امام صاحب کے اختتام سورہ فاتحہ پر کچھ اور بچوں کی جماعت میں شرکت سے ان بچوں کو اور تقویت ملی اور جو آواز مسجد کے صحن کے باہر تک تھی اب آس پاس کے گھروں تک بھی شاید پہنچ گئی، بات خیر اتنی ہی رہتی تو کوئی حرج نہیں تھا کہ ان معصوم نونہالوں کو ہم نے ہی بتایا تھا کہ سورہ فاتحہ دراصل دعا ہے اور دعا کے اختتام پر نماز میں بھی آمین کہنا باعث قبولیت دعا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کو ہم یہ بتانا بھول گئے تھے کہ بلند آواز سے آمین بالجھر کا مطلب صرف اتنی بلند آواز سے کہنا ہے کہ بغل میں موجود نمازی سن سکیں، وہ بچے بیچارے جلد قبولیت دعا کے شوق میں یہ سمجھ بیٹھے کہ جتنی بلند آواز سے ہم آمین کہیں گے شاید اتنی جلد ہماری دعا قبول ہوگی، خیر، تیسری رکعت شروع ہوئی، اب ان کو معلوم تھا کہ ان دو آخری رکعتوں میں ہمارے لیے آمین بالجھر کا موقع نہیں رہا، چنانچہ بعض بچے آپس میں لڑنے لگے، ایک دوسرے کو دھکا دینے لگے بلکہ ایک دوسرے کا گریبان پکڑ کر کھینچنے بھی لگے، غرض یہ کہ اس قدر شور شغب اور ہنگامہ کرنے لگے کہ نماز سے میری پوری طرح توجہ ہٹ گئی اور میری حالت اس قدر ناقابل برداشت ہوگئی کہ میں نے ارادہ کرلیا کہ نماز توڑ کر ہی ان سب کی خبر لوں اور ان سب کی ایسی سخت پٹائی کروں کہ وہ اسی وقت مسجد سے بھاگ جائیں اور پھر کبھی جلد مسجد کا رخ نہ کریں، بالآخر میں نے یہ عزم مصمم کرلیا کہ سلام پھیرتے ہی امام کی دعا سے پہلے ہی ان سب کی خبر لوں گا اور ان کو ایسے طمانچے رسید کروں گا کہ بڑے ہوکر بھی وہ یاد رکھیں، میں نے اس وقت نماز سے فارغ ہونے کی جلدی میں امام کے بعد نہیں بلکہ امام کے ساتھ ہی اپنا سلام پھیرا اور تیزی سے اٹھ کر پیچھے

ان کی طرف مڑ کر ان کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ بچے ہم سے زیادہ ہوشیار اور تیز نکلے، وہ سب امام کے دونوں سلام پھیرنے کے انتظار میں رہ کر اپنے ممکنہ برے انجام سے بچنے کے لیے جس کا شاید ان کو اندازہ ہو گیا تھا امام کے دوسرے سلام کے پھیرنے سے پہلے ہی تیزی سے مسبوق مصلیوں کی صفوں کو پھاند کر مسجد سے باہر نکل گئے، میں بھی طیش وغصہ کی حالت میں صفوں کو پھاندتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا، اس وقت میرا بلیڈ پریشر آخری درجہ کو پہنچ گیا تھا، بالآخر محنت بسیار کے بعد ان میں سے کچھ بچے میرے ہاتھ لگے لیکن ان کو دیکھتے ہی اچانک میرا بلیڈ پریشر لو ہو گیا اور ان کی طرف اٹھنے والے میرے ہاتھ اچانک رک گئے۔ ___ آپ پوچھیں گے کہ کیا ان بچوں نے معافی مانگ لی، یا میرے پیچھے کوئی مصلی آ گیا اور اس نے مجھے ان کو مارنے سے روک دیا یا پھر مجھے خدا یاد آ گیا، ان بچوں پر اٹھنے والے میرے ہاتھوں کے نتائج مجھے مستحضر ہو گئے اور میں اس سے باز آ گیا، یا پھر میری طبیعت ہی اچانک بگڑ گئی اور سر چکرا کر وہیں بیٹھ گیا، یا پھر ان معصوم کلیوں کی شرارتوں پر رحمت عالم ﷺ کا مشفقانہ عمل مجھے یاد آ گیا اور میرے ہاتھ رک گئے، لیکن ان میں سے کوئی بات نہیں تھی، دراصل میرے ہاتھ لگنے اور پکڑے جانے والے اور نماز میں ناقابل برداشت شرارت کرنے والے ان بچوں میں میرا ایک بھتیجا بھی تھا جس کا مجھے پہلے سے علم نہیں تھا، اسی اپنے بچہ کی موجودگی نے میرے ہائی بلیڈ پریشر کو اچانک لو کر دیا تھا اور اس پورے مجمع میں اپنے بھتیجہ کو پیٹ کر میں خود اپنے گھر والوں کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا، دوسرے الفاظ میں ان کا جرم تو ناقابل معافی تھا لیکن اس وقت تک جب ان شریر بچوں میں کسی اپنے بھتیجا کے ہونے کا اندازہ مجھے نہیں تھا، خود اپنے بچہ کی طرف سے اس جرم کے سرزد ہونے سے وہی ناقابل معافی جرم اچانک قابل معافی بن گیا، دوسرے الفاظ میں شرارتیں کچھ دیر پہلے تک دوسروں کی تھیں تو قابل سزا تھیں لیکن اپنوں کی اچانک قابل نظر انداز ہو گئی۔

اس سرسری پیش آنے والے واقعہ کی روشنی میں آج ہم اپنے معاشرہ پر نظر دوڑائیں، ہمارا یہ طرز عمل زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے دوسرے خاندان کا کوئی فرد کوئی معمولی جرم بھی کرتا ہے تو اس کی مذمت بلکہ اس کی تشہیر میں ہم زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور اس کا چرچہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے، لیکن اس سے بڑا بھیانک جرم کسی اپنے سے ہو جاتا ہے تو ہم اس کی تاویل کرنے لگتے ہیں اور اس کے لیے بہانے تلاش کرتے ہیں، اپنے کسی ہم مسلک، ہم مشرب، ہم فکر اور ہم خیال سے کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی ہو جاتی ہے تو ہم اس پر پردہ ڈالنے، اس کو چھپانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، لیکن اپنے کسی حریف، فریق یا نظریاتی یا فکری طور پر مخالف شخص سے اس سے کم درجہ کا بھی گناہ ہو جاتا ہے تو ہمارا ردعمل کس قدر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن غلطی بہرحال غلطی ہے، چاہے اپنوں سے ہو یا غیروں سے، گناہ بہرحال گناہ ہے، مجھ سے ہو یا کسی اور سے، اگر میرے یا میرے کسی عزیز یا دوست یا ہم فکر کی غلطی قابل تاویل یا پردہ پوشی کے قابل ہے تو فریق مخالف کا جرم بھی اسی طرح ستر پوشی و درگذر اور معافی کا استحقاق رکھتا ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں یہی وہ مطلوب تصور واستحضار ہے جو ہمیں کسی کی تحقیر وتذلیل سے روک سکتا ہے۔